شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)

میرا جی: سو برس کی عمر میں

میرا جی نے لکھا تھا کہ میں صرف دو زمانوں میں جیتا ہوں، ماضی اور حال یہ عجیب سی بات ہے، کیوں کہ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میرا جی کو اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ مستقبل ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ لیکن ایسے لوگ تو وہ ہوتے ہیں جنھیں اپنے '' شاندار ماضی'' کے بارے میں افسانے تراشنے اور اپنے حال کو روشن سے روشن تر بنانے کے لیے ہر جائز اور ناجائز کوشش میں اپنا وقت صرف کرنے کے سوا کوئی اور کام نہیں آتا۔ لیکن میرا جی کی زندگی تو ان دونوں باتوں کی نفی کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے ماضی کو کسی رومانی رنگ میں پیش نہیں کیا (پدرم سلطان بود، یا پھر یہ کہ میں بچپن سے بہت ہی حساس اور درد مند دل لے کر پیدا ہوا تھا، یا پھر یہ کہ میں نے بہت ہی کم عمر میں شعر کہنا، اور تنقید اور افسانہ لکھنا شروع کر دیا تھا، یا میں نے بچپن ہی میں ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالی تھیں، وغیرہ۔) وہ اگر ماضی میں زندہ تھے تو صرف اس معنی میں کہ ماضی کی کچھ یادیں (حقیقی، یا مفروضہ) ان کی تخلیقی زندگی کا بھی حصہ تھیں۔ انھوں نے روایتی معنی میں، یا کسی بھی معنی میں، اپنے حال کو، یا اپنا حال درست کرنے کی کوشش نہ کی۔ ایک آدھ بار کو چھوڑ کر انھوں نے روپیہ کمانے، دنیاوی کامیابی حاصل کرنے، مادی خوش حالی اور دنیاوی عزت داری حاصل کرنے کا خیال نہ کیا اور نہ ان معاملوں سے کبھی کوئی عملی سروکار ہی رکھا۔ ادیب کی حیثیت سے شہرت انھیں بہت نوعمری میں حاصل ہی ہو چکی تھی، لہٰذا یہاں بھی ان کی زندگی میں کوئی ایسا دباؤ، کوئی ایسی تمنا نہ تھی کہ وہ شہرت کے پیچھے پیچھے بھاگے پھریں۔ سچ پوچھیے تو شہرت خود ان کے پیچھے پیچھے بھاگی پھرتی تھی۔ لہٰذا اگر حال ان کی زندگی کا بہت بڑا سروکار تھا تو وہ یقیناً اس معنی میں تھا کہ وہ روزمرہ کی زندگی کو احساسات اور اور جذبات، اور درد مندی کی سطح پر جینے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انھوں نے کیٹس (John Keats) کا مشہور جملہ شاید پڑھا ہو جو اس نے اپنے بھائی کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

oh! for a life of sensations rather than thoughts.

لیکن بہر حال، انھوں نے اپنی زندگی کا معلوم حصہ روزمرہ کے احساسات اور تجربات ہی سے معاملہ کرنے، انھیں سمجھنے اور اپنی شاعری کا حصہ بنانے، ان کی روشنی میں اپنے ذہن اور مطالعے کو فروغ دینے

میں گذارا۔

میرا جی کی شاید ہی کوئی نظم ایسی ہو جس میں حقیقی زندگی کے تجربات کو مابعد الطبیعیات کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہو۔ "جاتری"، "سمندر کا بلاوا"، "مجھے گھر یاد آتا ہے"، "محرومی" اور "یگانگت" وغیرہ میں بھی، جو بظاہر کچھ "فلسفیانہ" اور تفکراتی قسم کی نظمیں ہیں، تجربہ اور احساس کی جگہ مجرد فکر کی کارفرمائی نہیں دکھائی دیتی۔ یہ نظمیں بے انتہا شدید احساس اور درد سے مملو ہیں، لیکن ان میں تعقل کا حصہ (اگر وہ ہے بھی تو) بہت کم ہے۔ فلم ڈائرکٹر ایم۔ اے۔ لطیف، بی۔ اے۔ کے نام ایک خود نوشت نما نوٹ (مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۶) میں میرا جی نے لکھا ہے:

سچ ہے، سماج کے فرائض، جس طرح دنیا انھیں سمجھتی ہے، میں نے جیسا میں انھیں سمجھتا ہوں، پورے نہیں کیے۔ لیکن میں نے اپنی جسمانی زندگی سے زیادہ جس قدر ذہنی زندگی بسر کی ہے، اس کا لحاظ کسے ہوگا؟

لہٰذا میرا جی کے لیے حال اور ماضی زیادہ معتبر تھے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ "ذہنی زندگی" بسر کرتے تھے، یہ نہیں کہ ان کی توجہ کا دائرہ بہت کم تھا اور وہ صرف لمحۂ موجود کے لیے زندہ رہتے تھے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی واردات اور ظاہری واردات کو ہر طرح چھان بین کر دیکھتے اور اس میں شاعری کے امکانات تلاش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا جی (اور باتوں کے علاوہ) حواس خمسہ کا تجربہ اور اظہار کرنے میں ہمارے تمام شاعروں سے آگے ہیں۔ حواس خمسہ والی بات پر بحث میں آئندہ کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ لیکن یہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ کیٹس (Keats) اور مجاز کو ملا کر اثر صاحب مرحوم نے ایک جملہ کہا تھا۔ وہ جملہ مشہور تو ہوا لیکن مقبول نہ ہوا۔ وہ اپنی بات اگر میرا جی کے باب میں کہتے (کہ اردو ادب میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا) تو شاید اس پر زیادہ دھیان دیا جاتا، کیونکہ وہ بات ایک طرح سے سچ بھی ہوتی۔

میرا جی پر متفرق بہت کچھ لکھا گیا ہے، ایک دو کتابیں بھی ہیں، خاص کر رشید امجد کی کتاب "میرا جی، شخصیت اور فن" (لاہور ۱۹۹۶) اور شافع قدوائی کی مختصر اور سرسری کتاب "میرا جی" (ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی، ۲۰۰۱)۔ پھر "شعر و حکمت" کے دور دوم کی پہلی کتاب جس میں میرا جی کے بارے میں، اور خود میرا جی کی بعض نادر تحریریں شامل ہیں، اور جمیل جالبی کی مرتبہ ضخیم و جحیم "میرا جی، ایک مطالعہ" (کراچی ۱۹۸۹، اور دہلی، ۱۹۹۲) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ گجراتی النسل اور امریکی نژاد گیتا پٹیل کی کتاب:

, On Gender: Historical Hauntings,Lyrical Movements
(2005,(Delhi and Desire in Miraji's Urdu Poetry,Colonialism

بھی ذکر کے لائق ہے۔لیکن ان تمام تحریروں میں خرابی یہ ہے کہ ان میں میراجی کی زندگی ،ان کی ''شخصیت''، اور شخصیت کے ''ناپسندیدہ'' پہلوؤں پر ان کی شاعری سے زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ کسی کی ذات کے ''ناپسندیدہ'' پہلوؤں پر بات کرنے میں مزہ بھی زیادہ آتا ہے، اور ہم اپنی ذمہ داری سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں، یہ کہہ کر کہ میراجی کی زندگی، شخصیت، اور شاعری کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

ابھی حال میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے ''میراجی صدی: منتخب مضامین'' (مرتبین: رشید امجد، عابد سیال) کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس کے دیباچے میں افتخار عارف نے درست لکھا ہے :

ہماری کم نصیبی کہ ہم نے میراجی پر اس طرح توجہ نہیں دی جس کا وہ بجا طور پر استحقاق رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت اور ذاتی زندگی کے بارے میں جھوٹی سچی کہانیاں تو زیر بحث آتی رہیں مگر ان کے ادبی کام پر جم کر نہیں لکھا گیا۔

افتخار عارف کے افسوس کے باوجود اس کتاب کے مشمولات کم و بیش اسی طرح کے ہیں جس کا انھوں نے شکوہ کیا ہے۔ رشید امجد کا سوانحی مضمون (بلکہ ایک چھوٹی سی کتاب ہی سمجھیے) اس مجموعے کی جان ہے، لیکن افسوس کہ اس کا بھی بڑا حصہ میراجی کی ''شخصیت اور ذاتی زندگی کے بارے میں جھوٹی سچی'' کہانیوں اور تذکرے پر مبنی ہے۔ بعض جگہ اغلاط کتابت نے مطلب بھی مسخ کر دیا ہے۔ مثلاً (ص ۷۷):

ازل کے متلاشی اس مسافر کو، جو زندگی بھر قدیم ہندوستان کی روح کا پرستار رہا، بمبئی کے ذرائع ابلاغ میں صرف اس وجہ سے جگہ نہ ملی کہ وہ مسلمان اور ''پاکستانی'' ہے۔ اختر الایمان نے قدروں کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔

مسلمان اور پاکستانی نہ کہہ کر ''اردو کا ادیب'' کہنا چاہیے تھا۔ میراجی کے بارے میں کبھی یہ بحث تھی ہی نہیں کہ وہ ''مسلمان'' یا ''پاکستانی'' ہیں۔ اختر الایمان اور ان کی بیگم نے جس طرح میراجی کی آخری سانسوں تک ان کا ساتھ دیا، اس کو دیکھتے ہوئے یہ جملہ کتابت کی غلطی ہی معلوم ہوتا ہے کہ ''اختر الایمان نے قدروں کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔'' اور جہاں تک ذرائع ابلاغ کی مہربانیوں کا سوال ہے، تو میراجی کے تقریباً پچاس سال بعد خود اختر الایمان کے انتقال پر ہندوستانی انگریزی اخباروں میں خبر چھپی کہ ''فلمی دنیا کے مصنف اختر الایمان نہیں رہے۔''

میراجی کو ''بدنام'' کرنے، ناپسندیدہ شخص کی حیثیت سے ان کا اسطور قائم کرنے، ان کی ''غیر ذمہ دار'' اور منشیات میں غرق زندگی کو ان کی اصل زندگی کے طور پر ظاہر کرنے میں ان کے خاکہ نگاروں، خاص کر

شاہد احمد دہلوی، منٹو، اخلاق احمد دہلوی اور محمود نظامی کا بڑا حصہ ہے۔ محمد حسن عسکری ان کے واحد خاکہ نگار ہیں جنھوں نے ان باتوں کا ذکر کم کیا ہے، بلکہ بالکل ہی نہیں کیا ہے۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں:

ان کا تخیل اس قدر افسانوی واقع ہوا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ زندگی چاہے زندگی نہ رہے مگر افسانہ ضرور بن جائے، خاص کر جب کہ اس افسانے کو دیکھنے والے بھی موجود ہوں...... یہ بات کچھ ان کے دوستوں اور جاننے والوں تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ جس نے ان کی تحریر پڑھ لی، اس نے ایک افسانہ ان کے بارے میں گھڑنا شروع کر دیا۔

ذرا غور کیجیے۔ کسی معاصر کے بارے میں کسی اور ادیب نے اتنی گہری اور سچی بات کہی ہوگی؟ یہ عسکری ہی کے مزاج کی یک دردی Empathy تھی جس نے انھیں میرا جی کی شخصیت کی گہرائی تک پہنچ جانے میں ان کی مدد کی۔ اختر الایمان نے ''سہ آتشہ'' کے عنوان سے میرا جی کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا (۱۹۹۴)۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو ان کے پاس محفوظ تھیں اور کسی گذشتہ مجموعے میں شامل نہ تھیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں اختر الایمان لکھتے ہیں:

ابھی تک میرا جی پر جو لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر رمی ہے، اور تحریروں کا رنگ افسانوی ہے، انھیں ایک دھند لکے اور رومان کی چادر میں لپیٹ دینے کی کوشش۔ لمبی لمبی کناری سی مونچھیں، شانوں تک پڑی ہوئی زلفیں، کبھی کوٹ کے اوپر کوٹ، پتلون کے اوپر پتلون۔ بغل میں کاغذوں کا پلندہ۔ منہ میں پان، ہاتھ میں چھوٹے بڑے تین گولے۔ کچھ نے ان کی بہت شراب نوشی پر بہت زور دیا ہے۔ کچھ نے دنوں بلکہ مہینوں نہ نہانے پر۔ مگر یہ تو میرا جی نہیں، ان کی ہیئت کذائی ہے۔ ان کا بہروپ ہے۔

افسوس کہ ہم لوگوں نے بہروپ پر اس قدر زور دیا کہ میرا جی کا روپ سروپ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، اور اب تک کم و بیش اوجھل ہی ہے۔ جمیل جالبی نے ٹھیک لکھا ہے کہ ''میرا جی کی ذات سے ایسے ایسے واقعات وابستہ ہیں کہ ان کی ذات عام آدمی کے لیے افسانہ بن گئی ہے۔'' جمیل جالبی کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ ''عام آدمی'' سے ان کی مراد کم و بیش سبھی لوگ ہیں:۔ ان کے قاری، ان کے نقاد، ان کے افسانے کو بنانے اور اسے شہرت دینے والے۔ انھیں یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ یہ ''واقعات'' اگر صحیح بھی ہوں تو ان کو جان کر، یا ان کے بارے میں مزید چھان بین کر کے ہمیں میرا جی کے ادب کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکتا۔ عسکری کا مزید بیان ملاحظہ کریں:

میرا جی کو گفتگو کا بڑا سلیقہ تھا۔ دلچسپی اور شائستگی دونوں کو بیک وقت برقرار رکھنا بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔

......

ایک خصوصیت ان کی یہ تھی کہ کتاب ہر قسم کی پڑھتے تھے۔ادب،نفسیات،عمرانیات وغیرہ تو خیر ایک سلسلے کے مضمون ہوئے۔لیکن ایک زمانے میں انھیں کپڑوں کے ڈیزائن کا مطالعہ کرنے کا شوق ہوا۔کہا کرتے تھے کہ جب شادی ہوگی تو بیوی کو مشورہ تو دے سکوں گا۔اسی طرح، نہ معلوم کن کن موضوعات پر الم غلم کتابیں انھوں نے مجھے زبردستی پڑھوائیں......زندگی کے ہر شعبے میں انھیں متفرقات کا شوق تھا۔اسی سلسلے میں انھوں نے پان بنانا سیکھا تھا، بلکہ اپنے مخصوص ہنر کے ساتھ ساتھ اس فن میں بھی [انھوں نے] دو چار نئے طریقے ایجاد کیے تھے۔اور اس میں حال یہ تھا کہ چاہے ان کی باتیں بھول جاؤں لیکن ان کا پان نہیں بھول سکتا۔دس منٹ میں تو ان کا ایک پان بنتا تھا۔بچارے اپنے لیے پانوں کا ایک پلندہ لے کے چلتے تھے لیکن ان کے سارے پان تبرک ہو کے بٹ جاتے تھے۔......ان کے جاننے والوں نے ان کی شراب نوشی کے قصے بہت بیان کیے ہیں، لیکن مجھے حسرت رہی کہ میرا جی کو نشے کی حالت میں دیکھوں۔

اب محمد حسن عسکری سے ایک بات اور سن لیجیے۔انھوں نے ایک افسانہ لکھا اور میرا جی کو بھیجا کہ وہ اس زمانے میں ''ادبی دنیا'' کے ایڈیٹر تھے۔لیکن عسکری نے یہ شرط بھی لگائی کہ افسانہ فرضی نام سے شائع ہو۔ ''ہفتے بھر بعد میرا جی کا خشک سا جواب آیا، بالکل دفتری زبان میں، کہ صاحب، ہم فرضی نام سے کوئی چیز نہیں چھاپتے۔'' بالآخر عسکری نے افسانہ اپنے ہی نام سے ''ادبی دنیا'' میں چھپوالیا۔ پھر وہ لکھتے ہیں: ''میرا جی نے مجھے افسانہ نگار بنا دیا تو ''نیا ادب'' گروپ کے بھی بعض حضرات مجھے خط لکھنے لگے، لیکن وہ مجھے صرف شاباشی دیتے تھے۔میرا جی یہ بھی پوچھا کرتے تھے کہ آئندہ کس قسم کا افسانہ لکھو گے؟''

آپ نے غور کیا؟ میرا جی یہ نہ پوچھتے تھے (جیسا کہ کوئی عام مدیر کرتا) کہ آئندہ افسانہ کب لکھو گے، بلکہ یہ کہ تمھارا اگلا افسانہ کس قسم کا ہوگا؟ یہ ان کی ادبی فراست اور مدیرانہ سوجھ بوجھ تھی کہ انھوں نے ایک ہی افسانہ پڑھ کر سمجھ لیا کہ عسکری کوئی چلتے ہوئے طرز کے افسانے نہیں ہیں، بلکہ وہ کئی طرح کی افسانہ نگاری کے تجربے کرنا چاہتے ہیں اور ان کے تجربے کامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔میرا جی کی مدیرانہ بیدار مغز شخصیت اور ادبی فراست کی ایک اور مثال اختر الایمان کے ایک بیان میں بھی ملتی ہے۔انھوں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اپنی ایک نظم ''ادبی دنیا'' کو بھیجی۔وہ لکھتے ہیں: ''کچھ دن بعد نظم واپس آ گئی۔نظم سے متعلق میرا جی کا ایک نوٹ تھا، 'جس عالم میں نظم کہی ہے اسی عالم میں نظر ثانی کیجیے۔'' ذرا غور کیجیے، صرف نظر ثانی کے لیے تو کوئی بھی مشورہ دے سکتا ہے، لیکن جس عالم میں نظم کہی گئی ہے اسے اپنے اوپر پھر طاری کرنے کا مشورہ یہ بتاتا ہے کہ نظم پر نظر ثانی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب آپ اس کیفیت کو پھر طاری کریں جس نے آپ سے نظم کہلائی ہے۔

میرا جی کا قول تھا کہ میں اپنے بارے میں خود ہی طرح طرح کی باتیں پھیلایا کرتا ہوں۔ اس میں کچھ انتقام یا کچھ ڈراما سازی کا جذبہ رہا ہوگا، لیکن یہ ایک کھلنڈرے نوجوان کی حس مزاح کا بھی اظہار ہوسکتا ہے۔ میرا جی کے بارے میں لکھتے یا سوچتے وقت ہم لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ عمر کے زیادہ تر حصے میں وہ نوجوان ہی رہے اور جب مرے تو اس وقت کے ہندوستانی معیاروں سے بھی وہ جوان ہی تھے۔ نیاز فتح پوری نے تو فراق صاحب کو ۱۹۳۷ میں "ایک نوجوان ہندو شاعر" بتایا تھا، حالاں کہ اس وقت فراق صاحب کی عمر چالیس سے متجاوز تھی (ان کا سال پیدائش ۱۸۹۶ ہے)۔ لیکن ہم لوگ میرا جی کے بارے میں خیال کرتے ہیں کہ وہ قدیم رشیوں منیوں کی طرح سینکڑوں برس کے ہوکر مرے ہوں گے، حالاں کہ جب وہ مرے تو ان کی عمر سینتیس (۳۷) برس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔

یہ بات تو بہر حال درست ہے کہ میرا جی اپنی تحریر اور عام گفتگو میں جس قسم کی فراست اور ذہن کی جس بلندی کا اظہار کرتے تھے، اس کی توقع کسی انتہائی تجربہ کار، دروں بیں اور عملی اور نظری دونوں طرح کی عقل سے بہرہ ور شخص ہی سے ہوسکتی ہے۔ (اور شاید اس لیے بھی لوگ انھیں جوان کے بجائے بوڑھا تصور کرنا پسند کرتے ہیں۔) محمد حسن عسکری اور اختر الایمان کو جو مشورہ میرا جی نے دیا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ میرا جی اور امیش ماتھر کی دوستی دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے لے کر ممبئی تک برقرار رہی۔ امیش ماتھر کا بیان ہے کہ میرا جی مجھ سے اکثر کہتے تھے، "امیش تم رائٹر کبھی نہیں بن سکتے، کیونکہ تم روز نہیں لکھتے۔ رائٹر تو وہی ہوتا ہے جو روز لکھے۔" ایسی باتیں وہ شخص نہیں کہہ سکتا جس کا دل دماغ اور جسم سب شراب نے ماؤف کر دیا ہو۔ امیش ماتھر نے لکھا ہے، "میرا جی کے مزاج میں ایک عجیب طرح کا بکھراؤ تھا اور ساتھ ہی ساتھ ادب کے لیے لگاؤ بھی، ایسا لگاؤ جس کا نبھاؤ وہ بے سروسامانی کے باوجود بھی کرتے رہے۔" (امیش ماتھر کا مضمون اگرچہ نہایت عمدہ ہے لیکن کسی باعث نظر انداز ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ ماہنامہ "آج کل" دہلی (مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی) کی اشاعت مورخہ دسمبر ۲۰۰۰ کے سوا کہیں اور شائع نہیں ہوا۔)

میرا جی کی شاعری کو اکثر مبہم، یا مشکل، کہا گیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ میں کبھی کبھی ان کی نظم کے معنی دریافت کرتا تھا۔ اپنی نظمیں "وہ خدا جانے کب کہتے تھے اور کس کیفیت میں کہتے تھے۔ چند نظمیں خود ان سے سمجھیں تو سمجھ میں آئیں اور بعض خود ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔" ممکن ہے میرا جی ٹال رہے ہوں، یا یہ اشارہ کرنا چاہتے ہوں کہ جب تم سمجھے نہیں تو میں کیا سمجھاؤں۔ بہر حال، یہ بات اتنی پھیلی (یا پھیلائی گئی) کہ ایک استاد قسم کے مورخ ادب نے لکھ دیا کہ میرا جی کی نظمیں کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں، یہاں تک کہ انھوں نے ایک کتاب لکھی، "اس نظم میں" اور اس میں اپنی نظموں کے معنی بیان کیے۔ آپ سمجھ سکتے

ہیں کہ جب ''اعلیٰ ادبی حلقوں'' میں میرا جی کے بارے میں یہ بے خبری ہو تو انھیں اچھے پڑھنے والے کہاں سے مل سکتے تھے؟ خود میرا جی اپنے بارے میں کس قدر باخبر تھے (شاعر کی حیثیت میں بھی اور عام انسان کی حیثیت میں بھی) اس کا اندازہ ایم۔اے۔لطیف کے نام اس تحریر سے کچھ ہو سکتا ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا۔اس میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

میں دنوں، مہینوں بلکہ بعض دفعہ ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ سال تک نہیں نہایا کرتا۔دنیا کو یہ بات بری معلوم ہوتی ہے اور میں اسے سمجھتا ہوں...... مگر یہ بات سوچنے کے باوجود اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس تمام صورت حال، اس سماج، اس نظام حیات و کائنات کا مقصد کیا ہے...... میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ انسان کی ایک سے زیادہ خوبیاں اس کے صرف ایک عیب کی مخلصانہ پردہ پوشی نہیں کر سکتیں...... میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ۔۔لیکن پھر وہی خیال پرستی، پھر وہی جزئیات بینی، پھر وہی زمینی سطح سے ذرا اوپر کی باتیں۔اس مسلسل تحریر میں تو آپ بیتی لکھنا چاہتا ہوں۔

ذرا ملاحظہ کیجیے، کیا یہ وہی میرا جی ہے جو ہمیں اس کی شخصیت کے نام نہاد خاکوں میں نظر آتا ہے؟ لیکن ہمیں تو اس جنس زدہ، غلیظ میرا جی سے کام ہے جس کے ہاتھوں میں لوہے کے تین گولے ہوتے تھے اور جس نے اپنی ساری شرم و حیا اور حفظ نفس ٹھرے کے ایک گلاس کے عوض ہمیشہ کے لیے فروخت کر دی تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کے فوراً بعد شعرا کی جو غیر معمولی نسل ہمارے افق پر نمایاں ہوئی، اس کے پانچ سر برآوردہ ناموں میں میرا جی سرفہرست ہیں۔میں یہ بات کئی بار کہہ اور لکھ چکا ہوں، اور آج پھر کہتا ہوں کہ اقبال کے فوراً بعد آنے والے پانچ بڑے شعرا کی ترتیب میں میرا جی سب سے اوپر ہیں، پھر راشد، ان کے بعد اختر الایمان، پھر مجید امجد اور سب سے بعد میں فیض ہیں۔میں یہ بات دو وجہوں سے کہتا ہوں: ایک معمولی وجہ تو یہ کہ میرا جی نے اپنے بعد کے شعرا اور نقادوں اور افسانہ نگاروں پر جو اثر ڈالا، وہ ان کے ساتھیوں کے اثر سے زیادہ وسیع اور پائدار تھا۔میرا جی کے بغیر جدید ادب کو قائم اور مستحکم ہونے میں بہت دیر لگتی۔فیض صاحب کی عظمت اور مقبولیت کا کلمہ سب پڑھتے ہیں، لیکن جو لوگ شعر کو فن اور علوئے ذہن کا اظہار سمجھتے ہیں اور شاعر کی بڑائی اس بات میں دیکھتے ہیں کہ اس کے یہاں موضوعات اور تجربات کی وسعت کتنی ہے اور اس نے شعر کی ہیئت کے نئے امکانات کو کہاں تک دریافت اور وسیع کیا، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ میرا جی کا کارنامہ ہمارے عہد میں بے مثال ہے۔اور یہ دوسری وجہ ہے جس کی بنا پر میں میرا جی کو اس زمانے کے بڑے شعرا میں سرفہرست رکھتا ہوں۔□□□

سرپرست : جناب منور پیر بھائی (پونہ)

مدیر

وسیم فرحتؔ (علیگ)

Email:wkfarhat@gmail.com Cell.09370222321

نائب مدیران: کلیم ضیاؔ، احسنؔ ایوبی

مشیر

شمیم فرحتؔ

شمارۂ ہٰذا	۱۰۰ روپے
لائبریری اور اداروں سے	۲۵۰ روپے
لائف ممبر شپ	۵۰۰۰ روپے
یورپی ممالک کیلئے	۱۲ امریکی ڈالر
برطانوی ممالک کیلئے	۱۶ پاؤنڈ
پاکستان کیلئے	۹۰۰ ہندوستانی روپے
خلیجی ممالک کیلئے	۹۰۰ ہندوستانی روپے

خط و کتابت کے لیے:

Waseem Farhat (Alig)
Post Box No.55, H. O,
AMRAVATI-444601(M.S)INDIA

صرف زرِ سالانہ اور رجسٹری ڈاک کے لیے:

The Editor,URDU,
"Adabistan", Near Wahed Khan
UrduD.Ed.College, Walgaon Road,
AMRAVATI-444601,Maharashtra (India)

پاکستانی خریداروں کا صرف زرِ سالانہ بھجوانے کیلئے:

بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان
II-B/18، کمرشل ایریا، نزد سپر ایشیا بیکری، ناظم آباد، کراچی
موبائل:0321-8291908

اگر آپ چیک یا ڈرافٹ بھیجنا چاہیں تو صرف **SEHMAHEE URDU** اس نام سے بھیجیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں اور کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی صرف امراؤتی عدالت میں ہی کی جائیگی۔

Scanned by CamScanner